© rasailojaraid.com

حرفِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غیر مسلموں سے تعلقات
اور ان کے حقوق

(زیرِ طبع کتاب کا مقدمہ)

سید جلال الدین عمری

انسانی تعلقات کا مسئلہ سماج کا سب سے اہم اور نازک مسئلہ ہے۔ اس کی اہمیت اور نزاکت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کہ سماج میں مختلف افکار و نظریات اور عقائد و مذاہب کے ماننے والے ساتھ رہتے ہوں۔ ان کا طرزِ حیات اور ان کی تہذیب و معاشرت ایک دوسرے سے الگ ہو۔ اس صورت حال میں ظلم و زیادتی، حق تلفی اور ناانصافی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور عدل و انصاف اور حقوق کی ادائیگی میں فکری تعصبات، ذاتی اور قومی رجحانات اور سماجی عوامل رکاوٹ بننے لگتے ہیں۔ اس پر قابو پانا ہر مہذّب اور صالح سماج کی اولین ضرورت ہے۔

انسانی تعلقات کا اخلاق اور قانون سے رشتہ جڑا ہوا ہے۔ اخلاق کا ہدف ان تعلقات کو بہتر اور خوش گوار بنانا ہے۔ قانون اس لیے ہے کہ انھیں جائز حدود میں رکھے اور کسی کو ان سے انحراف اور تجاوز کی اجازت نہ دے۔ اخلاق اور قانون اپنا فرض ادا کریں تو سماج کو امن و امان اور سکون کی دولت نصیب ہوگی، ورنہ جنگل کا راج ہوگا، حقوق پامال ہوں گے اور طاقت ور کے ظلم اور چیرہ دستی سے کمزور سسکتے اور بلبلاتے رہیں گے۔

دنیا نے الفت و محبت کے پھول کھلتے بھی دیکھے ہیں اور قتل و خون اور فتنہ و فساد کی کشتِ خزاں کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ خدا کی اس زمین پر طبقات کا تصادم بھی رہا ہے اور ان کے درمیان اتحاد و اتفاق بھی پایا گیا ہے۔ ظلم و زیادتی اور استحصال کی تیز و تند آندھیاں بھی چلی ہیں اور عدل و انصاف اور ایثار و ترجیح کے خوش گوار مناظر بھی دیکھنے کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہب کی روح تقویٰ اور خداترسی ہے۔ وہ انسان کو اخلاق اور قانون کا پابند بناتا ہے اس لیے انسانی تعلقات کو بہتر اور خوش گوار بنانے اور عدل وانصاف کے قیام میں اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن افسوس کہ دنیا کے بیشتر مذاہب سے یہ روح جاتی رہی اور بے جان رسوم نے اس کی جگہ لے لی۔ انھوں نے یہ صلاحیت کھودی۔ کہ زمانہ کی رفتار اور تغیر پذیر حالات میں زندگی کے پیچیدہ مسائل اور ان کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ ان کے غیر عقلی اور جامد رویّے نے دنیا کو ان سے بے زار اور متنفر کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب سے رہنمائی کا مقام چھن گیا اور وہ انسان کی نجی زندگی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اجتماعی امور ومعاملات اس سے آزاد قرار پائے۔ یہ رویہ پہلے مغرب نے اپنایا اور اس کے زیر اثر مشرق نے بھی عملاً اسے قبول کرلیا۔

اس وقت دوسرے مذاہبِ عالم زیر بحث نہیں ہیں۔ البتہ یہ عرض کرنا ہے کہ اسلام کے بارے میں اس رویہ کو اختیار کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ لیکن مختلف اسباب وعوامل کے تحت دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کے ساتھ زیادہ سخت رویّہ اپنایا گیا۔ اسے اس طرح پیش کیا گیا جیسے وہ آج کے مہذّب سماج کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ اس کا فروغ نوعِ انسانی کے لیے سخت تباہ کن ہے اور اس کی تاریخ نوعِ انسانی کے لیے ظلم و زیادتی کی تاریخ ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق فرد سے ہے اور دوسرے کا ریاست سے۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام علیٰحدگی پسند ہے اور فرد کے اندر یہی رجحان پیدا کرتا ہے وہ دوسرے مذاہب کے ماننے اور مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں سے قطع تعلق کا حکم دیتا ہے اور مسلمانوں کو ان سب افراد سے کاٹ دیتا ہے جو اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بے بنیاد اعتراض ہے۔ اسلام کی واضح تعلیمات اس کی تردید کرتی ہیں۔ وہ غیر مسلموں سے عام انسانی اور اخلاقی روابط سے کبھی منع نہیں کرتا۔ ان سے سماجی، معاشرتی اور معاشی تعلقات کی اس نے اجازت دی ہے۔ البتہ وہ نہیں چاہتا کہ مسلمان کسی دوسرے گروہ میں ضم ہو جائیں۔ اس کے لیے اس نے کچھ حدود مقرر کر رکھے ہیں۔ ان حدود کی معقولیت سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ کسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

با اصول اور نظریاتی ملّت کے لیے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی ریاست کے بارے میں تصور یہ ہے کہ اس میں سارے حقوق مسلمانوں کو حاصل ہوں گے اور غیر مسلم بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم ہوں گے۔ وہ جنگی عزائم کے ساتھ کام کرے گی۔ حالانکہ اسلامی ریاست کا مقصد قرآن کے الفاظ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر (الحج: ۴۱) اور عدل وانصاف کا قیام ہے (الحدید: ۲۵) وہ ہر انسان کے جائز اور فطری حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔

ان خیالات کے پیچھے ناواقفیت اور لاعلمی کے ساتھ بہت سے تاریخی عوامل کارفرما ہیں۔ ان میں اسلام کی برتری کو تسلیم نہ کرنے کی نفسیات۔ اسلام کی سربلندی اور فرماں روائی کا خوف اور اسے کسی قیمت پر گوارا نہ کرنے کا جذبہ اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور عداوت بھی شامل ہیں۔ اس وجہ سے اسلام کی صاف اور واضح تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش تو نہیں ہوتی البتہ انھیں مسخ کرنے اور اسلام کو بھیانک شکل میں پیش کرنے کی تدبیریں ہوتی رہتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پورے رویّہ میں مسلمانوں کی کوتاہی کا بھی بڑا دخل ہے۔ انھوں نے مختلف مسائل میں غیر مسلموں کے سامنے سنجیدہ اور علمی انداز میں اسلام کا موقف واضح کرنے کی اس طرح کوشش نہیں کی جیسے ہونی چاہیے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط کی کمی بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ دونوں میں صدیوں سے ایک طرح کی دوری اور حجاب رہا ہے۔ ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے کے لیے جس ٹھنڈے ماحول کی ضرورت ہے وہ نہیں فراہم ہوا۔ اس لیے بدگمانیاں پیدا ہوتی اور نشوونما پاتی رہیں۔

اس پورے مسئلہ کو سمجھنے کے لیے بعض بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

۱۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ دنیا کے مذاہب میں کس کا رول شخصی اور انفرادی زندگی تک محدود ہے اور کس کے دائرے میں اجتماعی مسائل بھی آتے ہیں۔ البتہ اسلام کی حد تک یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ ایک جامع اور مکمل دین اور عقیدہ وعمل کا ایک مربوط نظام ہے۔ اس نے اس وسیع کائنات اور اس میں انسان کی حیثیت کے مطابق صرف مضبوط عقیدہ ہی نہیں دیا بلکہ اس کی بنیاد پر انسان کی زندگی کو ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاص رخ عطا کیا ہے۔ عبادات کے ذریعے خدا سے انسان کا تعلق جوڑتا اور اسے استحکام بخشتا ہے اور اخلاق اور قانون میں اس کے احکام کا اسے پابند بناتا ہے۔ خاندان، معاشرہ، ریاست، شخصی، ملی اور بین الاقوامی تعلقات سب اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہے۔ اس کے اس موقف سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے یہ مطالبہ صحیح نہ ہوگا کہ وہ انفرادی زندگی تک اپنے آپ کو سمیٹ لے۔ وہ محدود مذہبیت کا مخالف ہے جس میں خدا اور قیصر کے حقوق الگ الگ ہوں

۲۔ اسلام ایک عالمی دین ہے وہ خدا کا آخری پیغام ہے جو انسانوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کا خطاب سب انسانوں سے اور ان کے بھی طبقات سے ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ... (الاعراف: ۱۵۸)

(اے پیغمبر) کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ وہ اللہ جس کا آسمانوں اور زمین پر اقتدار ہے۔

جس دین کا خطاب دنیا کے تمام انسانوں اور ان کے تمام طبقات سے ہو، جو اس حیثیت سے سامنے آئے کہ وہ سارے عالم کی فلاح و نجات کا ذریعہ ہے۔ وہ کسی طبقہ سے نفرت اور عداوت کا سبق نہیں دے سکتا، ورنہ اس کا خطاب محدود ہو کر رہ جائے گا۔ جو نظریات طبقات کے درمیان کشمکش پیدا کرتے ہیں وہ ایک کے ذریعے دوسرے کا استحصال کرتے ہیں۔ ان میں عمومی اپیل نہیں ہوتی۔ وہ ایک کے لیے پرکشش ہوتے ہیں تو دوسرے کے لیے قابل قبول نہیں ہوتے۔

۳۔ اسلام نے اپنے عقیدے اور فکر کو عام کرنے کے لیے جبر و اکراہ کے تمام طریقوں کو رد کر دیا ہے۔ ان میں سے ہر طریقہ اس کے نزدیک ناجائز اور ممنوع ہے۔ اس کے لیے اس نے صرف دعوت و تبلیغ کی راہ کھلی رکھی ہے۔ وہ اپنی بات دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اسے قبول یا رد کرنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ اس نے صبر و ثبات کے ساتھ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے اور مخالفت اور مزاحمت کو عزم و حوصلہ اور ہمت سے برداشت کرنے کا حکم دیا ہے۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ

جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کرو اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

هَجْرًا جَمِيْلًا۔ (المزمل : ۱۰) ان کو اچھی طرح چھوڑ دو۔

اس نے بار بار کہا ہے۔

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (الزخرف : ۸۹) ان سے درگزر کیجئے اور سلام کہئے ان کو بہت جلد (اپنا انجام) معلوم ہو جائے گا۔

ایک جگہ ارشاد ہے :

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ o اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيْمُ o (الحجر : ۸۵-۸۶) ان سے اچھی طرح درگزر کیجئے تمہارا رب وہی ہے جو پیدا بھی کرتا ہے اور باخبر بھی ہے۔

اس نے اپنے ماننے والوں کی یہ خوبی بیان کی ہے۔

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران : ۱۳۴) وہ غصہ کے پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔

اس نے ہدایت کی ہے کہ بات چیت میں، دعوت میں اور اپنے طرزِ عمل میں ایسا رویہ اختیار کیا جائے جس سے بدترین دشمن کی دشمنی ختم ہو جائے اور وہ دوستوں کی صف میں آجائے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ o وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ o (حم السجدہ : ۳۴-۳۵) دفاع کرو (جواب دو) اس طریقہ سے جو بہتر ہو۔ اس سے تمہارے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ جگری دوست ہو جائے گا۔ یہ خوبی صبر کرنے والوں ہی کو ملتی ہے۔ یہ ان ہی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والے ہیں۔

کیا ان واضح تعلیمات کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلام اپنے مخالفوں کو برداشت نہیں کرتا اور ان سے جنگ کی زبان میں بات کرتا اور اپنا عقیدہ ان پر بہ جبر مسلّط کرتا ہے۔

۴۔ اسلام سچے دل سے خدا اور رسول کو ماننے اور خوش دلی سے ان کی اطاعت کا نام ہے۔ یہ چیز جبر و اکراہ سے نہیں پیدا ہوتی۔ جہاں جبر و اکراہ ہوگا وہاں ایمان اور اسلام کا اظہار تو ہو جائے گا۔ لیکن حقیقت میں یہ ایمان نہیں بلکہ نفاق ہوگا۔ قرآن مجید نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نفاق کو دل کا روگ، جھوٹ اور خدا اور رسول کے ساتھ دھوکہ اور فریب کہا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ۝ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا، وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۝

(البقرہ: ۸ - ۱۰)

لوگوں میں بعض وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے حالانکہ وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ وہ دھوکا دے رہے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان والے ہیں۔ وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور اسے محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ ہے۔ اللہ نے ان کے اس روگ میں اضافہ کر دیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بول رہے تھے۔

اس نے کہا کہ منافقین کا وہی انجام ہوگا جو انجام کہ خدا کے منکرین کا ہے:

إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا (النساء: ۱۴۰)

بے شک اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں یک جا جمع کردیگا۔

ایک اور جگہ ان کے انجام کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: ۱۴۵)

بے شک منافقین جہنم کے سب سے نیچے درجے میں ہوں گے۔

قرآن مجید نے منافقین پر جتنی سخت تنقید کی ہے اور ان کی ذہنی پستی، خود غرضی، بے عملی بلکہ بدعملی کو نمایاں کیا ہے اور اسلام کے خلاف ان کی سازشوں کا پردہ چاک کیا ہے اور مسلمانوں کو ان سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی ہے، کیا اس کے بعد یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کی صفوں میں منافقین کا اضافہ ہوتا چلا جائے؟ کیا وہ ایسا طریقہ اختیار کرے گا کہ سماج میں نفاق کی آبیاری ہو اور وہ فروغ پاتا چلا جائے؟ اسلام اگر جبر و اکراہ کے موقف میں ہو تو بھی کسی کو ایمان اور اسلام پر مجبور نہیں کر سکتا اس لیے کہ اس سے نفاق کی راہ کھلتی ہے۔ دنیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا کوئی عقیدہ اور کوئی فکر نفاق کو برداشت نہیں کرسکتا۔ کیا اسلام ہی اس کے ابھرنے اور پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کرے گا؟

اسلامی ریاست کے ذکر کے ساتھ یہ سوال ابھر آتا ہے کہ اس میں غیر مسلموں کی کیا حیثیت ہوگی؟ ان کے حقوق کیا ہوں گے؟ اور ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جائے گا؟ اس ذیل میں بھی بعض باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں:

۱۔ اسلامی ریاست انسانی حکمرانی کی جگہ اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں اقتدار کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے۔ کوئی فرد یا گروہ یا مجموعۂ افراد نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ریاست اپنا نظم چلاتی ہے۔ اس میں حالات و ظروف کے لحاظ سے نئے قوانین بھی وضع ہوں گے اور نئی راہیں بھی تلاش کی جائیں گی، لیکن یہ سب کچھ کتاب و سنت کے حدود کے اندر ہوگا۔ اس سے باہر نکلنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی۔

۲۔ اسلامی ریاست کی باگ ڈور فطری طور پر ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی جو قرآن و حدیث پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے مملکت کی اساس تسلیم کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا اس پر ایمان نہیں ہے ان پر نہ تو اس کی ذمہ داری ڈالی جاسکتی ہے اور نہ وہ اسے خوش دلی سے چلا سکتے ہیں۔ لیکن ریاست میں انھیں خدا اور اس کے رسول کی پناہ حاصل ہوگی۔ اسلامی قانون کی رو سے ان کے بنیادی حقوق محفوظ ہوں گے۔ کسی بھی فرد یا جماعت کو ان حقوق پر دست درازی کی اجازت نہ ہوگی۔ انتظامی امور میں حکومت ان کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

۳۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت اور ان سے تعلقات کا یہ قانونی پہلو ہے۔ لیکن عام زندگی میں قانون سے زیادہ اخلاقی رویہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسلام نے تعلقات میں صداقت اور راست بازی کی پابندی اور جھوٹ اور مکر و فریب سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ رعونت اور استکبار کی جگہ تواضع اور خاکساری کا مزاج پیدا کیا ہے۔ درشت مزاجی اور شدت کے مقابلے میں نرمی اور رافت کو پسند کیا ہے۔ غیظ و غضب پر قابو پانے اور تحمل و برداشت کا رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ انتقام میں حد سے آگے نہ بڑھنے اور عفو و درگذر سے کام لینے اور برائی کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بدلہ بھلائی سے دینے کی ترغیب دی ہے۔ شر اور فتنہ وفساد سے بچنے اور ہر حال میں عدل وانصاف پر قائم رہنے کی تاکید کی ہے۔ اس معاملے میں اس نے اپنوں اور غیروں میں فرق نہ کرنے کا درس دیا ہے۔ یہ ہدایات بالکل عام ہیں، صرف مسلمانوں سے باہم تعلقات ہی میں نہیں بلکہ ایک مسلمان کا ربط وتعلق کسی بھی مذہب وعقیدہ کے ماننے والے کسی بھی فرد سے ہو، توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کا پابند رہے گا۔ جس سماج میں ان اخلاقیات کی فرماں روائی ہو وہاں فطری طور پر ظلم وزیادتی کے امکانات کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں گے اور اگر کبھی کسی کی طرف سے کوئی غلط قدم اٹھے تو قانون اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہوگا اور اپنا فرض انجام دے گا۔

۴۔ اسلامی ریاست کے ذکر کے ساتھ جہاد کا ذکر اس طرح چھڑ جاتا ہے جیسے اس کا مقصدِ وجود یا اولین ہدف مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف صف آرا کرنا اور جہاد کے نام پر قتل وخوں ریزی کا بازار گرم کرنا ہے۔ حالانکہ جس طرح دنیا کی ہر ریاست کو جنگ سے سابقہ پیش آسکتا ہے اسی طرح اسلامی ریاست کو بھی جہاد کرنا پڑ سکتا ہے۔ اسے اس کے حقیقی پس منظر میں اور انہی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ وہ ایسی جنگ نہیں ہے جو قتل وخوں ریزی اور انسانوں کو محکوم بنانے اور حکم رانی کی خواہش کی تکمیل کے لیے کی جاتی ہے بلکہ اس جنگ کے پیچھے اعلیٰ اخلاق، عدل وانصاف پر مبنی قانون، دعوت وتبلیغ کا مخلصانہ جذبہ اور انسانوں کے ساتھ خیر خواہی کی تمنا اور آرزو موج زن ہوگی۔ سوچا جا سکتا ہے کہ یہ جنگ دوسری جنگوں سے کتنی مختلف ہوگی اور اس کے کتنے اچھے ثمرات سامنے آئیں گے۔

آئندہ اوراق میں غیر مسلموں سے تعلقات کی بحث بھی ہے اور ان کے حقوق بھی بیان ہوئے ہیں۔ تعلقات میں خاندانی، سماجی، معاشرتی، معاشی کئی طرح کے تعلقات زیر بحث آئے ہیں۔ بعض اختلافی مسائل میں شریعت کا موقف واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے ان تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ تعلقات اور حقوق فرد اور ریاست دونوں ہی سے متعلق ہیں البتہ تعلقات میں شخصی پہلو غالب ہے۔ حقوق کا رشتہ ریاست سے جڑ جاتا ہے۔ ریاست کی بحث میں غیر مسلم کی حیثیت اور اس کے حقوق بیان ہوئے ہیں۔ اس ذیل میں جہاد اور اس کے احکام پر تفصیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں اسلام کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخری صفحات میں غیر مسلموں سے عدم تعلق کے احکام و ہدایات کا پس منظر بیان ہوا ہے۔

کتاب میں اصلاً قرآن و حدیث کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ان کی شرح و تفسیر میں معتمد علماء اور شارحین سے استفادہ کیا گیا ہے۔ بعض فقہی مسائل میں فقہاء کے خیالات تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں۔ ایک خیال یہ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے مسائل میں صرف وہ رائے بیان کی جانی چاہیے جسے لکھنے والا صحیح سمجھتا ہو اور جسے اس کے نزدیک ترجیح حاصل ہو، اس لیے کہ تفصیلات سے ذہن الجھن محسوس کرتا ہے۔

یہ ممکن تھا اور آسان بھی۔ لیکن جن حضرات کی فقہی ذخیرہ پر نظر ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کے سامنے دوسری رائیں بھی ہوتیں۔ اس اندازِ بحث پر یہ الزام بھی عائد ہوسکتا تھا کہ ذاتی رجحان کے تحت مخالف رایوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری محسوس ہوا کہ مختلف رایوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد ہی کسی رائے کو ترجیح دی جائے۔ پھر یہ کہ آج کا دور تقابلی مطالعے کا دور ہے۔ دنیا کے ہر موضوع کا جس میں فقہ بھی شامل ہے تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جدید علمی تصنیفات اور انسائیکلو پیڈیاز میں یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

ایک خیال یہ ہوسکتا ہے کہ بعض فقہاء کے خیالات سے غیر مسلم قارئین توحش محسوس کریں گے اس لیے ان کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات بھی بہت زیادہ وزنی نہیں ہے۔ اس لیے کہ مطالعۂ مذاہب اب عام ہو رہا ہے۔ ہمارے دینی اور فقہی لٹریچر سے مسلمان علماء ہی نہیں، غیر مسلم اصحاب علم بھی واقف ہیں۔ وہ فقہی اختلافات کے درمیان صحیح نقطۂ نظر جاننا چاہیں گے۔ اس لیے ان کے نقطۂ نظر سے بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ زیر بحث مسائل میں فقہی آراء کا تجزیہ کرکے بتایا جائے کہ موجودہ حالات میں بہتر اور موزوں رائے کیا ہے؟ اور اسے کس بنیاد پر ترجیح حاصل ہے؟ اس کوشش میں کوئی ایسی رائے نہیں اختیار کی گئی ہے جو بے دلیل ہو اور جسے سلف کی بالکل تائید حاصل نہ ہو۔

فقہاء کی رایوں میں سختی بھی ہے اور نرمی بھی۔ تنگی بھی ہے اور توسع اور کشادگی بھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن مسائل میں فقہاء کی رائیں سخت اور بے لچک معلوم ہوتی ہیں ۔ جیسے غیر مسلموں سے ملکی خدمات لینے یا مختلف معاملات میں ان پر اعتماد کا مسئلہ ۔ انھیں اس وقت کے حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے ورنہ انھیں ہدف تنقید بنایا جا سکتا ہے ۔

اسلام کے دور اوّل یا اس کی ابتدائی صدیوں میں جو ممالک فتح ہوئے یا جہاں تبلیغ و دعوت کامیاب رہی وہاں کی اکثریت دین کی آغوش میں آتی چلی گئی ۔ اس میں حجاز، مصر، عراق، شام اور افریقہ و ایشیا کے بعض ممالک شامل ہیں ۔ یہاں غیر مسلم تھے بھی تو چھوٹی سی اقلیت میں تھے ۔ ان ممالک میں اور اُس وقت کے حالات کے پیش نظر حکومتی اداروں میں غیر مسلموں کی شرکت نمایاں نہیں ہے اور فقہاء کے ہاں اس طرح کی رائیں بھی ملتی ہیں کہ ملکی نظام، اس کے دفاع اور حفاظت کے لیے ان کی خدمات کی چنداں ضرورت نہیں ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ایک ایسی مملکت ہے جس میں مسلمان اپنے تمام داخلی و خارجی امور میں خود کفیل ہیں اور انھیں کسی دوسرے کی احتیاج نہیں ہے ۔ یہ صورت حال ان ممالک کی نہیں ہو سکتی جہاں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود وہ اقلیت میں اور غیر مسلم اکثریت میں ہوں ۔ یہاں امورِ مملکت میں انھیں شریک کیے بغیر اس کا چلانا ممکن نہ ہوگا ۔ اس صورت میں بظاہر فقہی رائے بھی مختلف ہوگی ۔

موجودہ دور میں مختلف سماجی اور سیاسی عوامل کے نتیجے میں مشترک سماج وجود میں آرہے ہیں اور کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ اقلیتیں انتظام ملکی میں شریک رہیں ۔ انھیں الگ تھلگ نہ رکھا جائے اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے ۔

معاملات میں غیر مسلموں پر اعتماد اور عدم اعتماد کی بحث میں خیال ہوتا ہے کہ اس وقت کی پوری دنیا کی صورت حال کا بھی بڑا دخل رہا ہے ۔ اسلامی دور کی ابتدائی صدیوں میں مسلمان فی الجملہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے دوسروں سے برتر تھے، ان کے اندر خدا کا خوف تھا، اخلاقی بلندی تھی، معاملات کے صاف اور کھرے تھے، ان پر اعتماد کیا جا سکتا تھا اور کیا جاتا تھا ۔ اس کے برعکس ان کے اردگرد کی دنیا میں اخلاقی گراوٹ اور پستی تھی، افراد اور اقوام اپنا اعتماد کھو چکی تھیں، راست بازی، دیانت وامانت اور ایفاءِ عہد جیسی خوبیاں کم زور ہو چکی تھیں ۔ ان حالات میں یہ سوال بہر حال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیدا ہوتا تھا کہ مسلمان اپنے معاملات میں دوسروں پر کس حد تک اعتماد کر سکتے ہیں۔ بعض حضرات نے اسے انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھا کہ افراد صحیح اور غلط ہر طرح کے ہوتے ہیں، ان کے متعلق کوئی عمومی فیصلہ صحیح نہ ہوگا۔ بعض حضرات نے اسے بہ حیثیت قوم دیکھا اور عمومی رائے قائم کی۔

اب صورت حال بدل گئی ہے۔ مسلمانوں کے اندر تقویٰ اور خدا ترسی کی کیفیت ختم ہو چکی ہے، ان کا اخلاقی امتیاز باقی نہیں رہا، بلکہ بعض پہلوؤں سے ان کا معیار دوسروں سے فروتر ہے۔ معاملات میں دوسرے زیادہ بھروسہ کے قابل سمجھے جاتے ہیں اور ان پر مسلمانوں سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال بعض قدیم رایوں پر نظر ثانی کا تقاضا کرتی ہے۔

غیر مسلموں اور ان کے حقوق کے ذیل میں دارالاسلام، دارالحرب اور دارالامان جیسی بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں۔ یہ اصطلاحیں قرآن وحدیث میں استعمال نہیں ہوئی ہیں۔ بلکہ فقہاء کرام نے اسلامی نقطۂ نظر سے مختلف ممالک کی حیثیت واضح کرنے کے لیے وضع کی ہیں۔ ان کے نزدیک دارالاسلام وہ ہے جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں اور مسلمان امن و امان کی زندگی گزار رہے ہوں۔ اور مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں کسی قسم کا خوف اور خطرہ نہ لاحق ہو۔ دارالحرب وہ ہے جہاں کفر و شرک کا غلبہ اور احکام کفر و شرک جاری ہوں۔ دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان امن کا معاہدہ ہو تو وہ دارالامن ہوگا۔ ان سب کے احکام مختلف ہیں۔ اس وقت دنیا کا کوئی ملک دارالاسلام ہونے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کا دعویٰ نہیں کر رہا ہے۔ اسی طرح اس نے کسی ملک کو دارالحرب قرار دے کر اس سے اعلان جنگ نہیں کر رکھا ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک بین الاقوامی معاہدوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ حالات اس موضوع پر از سر نو غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

مسلم ممالک کی از روئے شرع ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مسلموں کے بنیادی حقوق کی حفاظت کریں۔ انھیں اپنے عقیدے اور مذہب پر عمل کی آزادی ہو۔ انھیں ترقی کے مواقع فراہم ہوں اور ان پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی از روئے دستور ممنوع ہو۔

غیر جمہوری ممالک میں، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں وہ بنیادی حقوق سے بھی محروم ہیں۔ لیکن جمہوری ممالک میں بڑی حد تک بنیادی حقوق انھیں حاصل ہیں۔ انھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ملا ہوا ہے۔ عقیدہ اور عبادت کی آزادی میسر ہے۔ وہ آزادی سے نماز اور روزے پر عمل کرسکتے ہیں، زکوٰۃ کا اپنا نظم چلا سکتے ہیں، حج کی انھیں اجازت ہے۔ مساجد کی تعمیر اور ان کی آبادکاری کا نظم کرسکتے ہیں۔ جمعہ اور عیدین کے قیام کی انھیں اجازت ہے۔ عائلی قوانین نکاح، طلاق، وراثت، وقف اور ہبہ وغیرہ جیسے معاملات میں اسلامی قانون ان پر نافذ ہوتا ہے۔ وہ دینی اور دنیوی تعلیم کا نظم کرنے اور دینی مدارس اور دنیوی تعلیم کے ادارے قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں ازروئے دستور انھیں مساوی حقوق حاصل ہیں اور وہ حکومت میں برابر کے شریک ہیں۔ بڑی بات یہ کہ جمہوری ممالک میں انھیں اپنے دین کی تبلیغ کی اجازت حاصل ہے۔ وہ اسے عام کرسکتے ہیں جس ملک کے یہ حالات ہوں اسے وہ چھوڑ نہیں سکتے۔ دین پر عمل کرتے ہوئے دعوت و تبلیغ کے جو مواقع انھیں حاصل ہیں ان سے انھیں فائدہ اٹھانا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ صورت حال دارالحرب یا دارالاسلام کی نہیں ہے۔ غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت وہ نہیں ہوگی جو حربیوں کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ وہ ملک کے پرامن شہری ہوں گے۔

کتاب میں یہ تمام پہلو پیش نظر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ اوراق اس کے دین کو سمجھنے کا ذریعہ ثابت ہوں، اس کے بندوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچے، لغزشوں سے درگزر فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے اسے شرفِ قبولیت بخشے۔

تحقیقات اسلامی کے سولہ سال

اشاریہ ۱۹۸۲-۱۹۹۷ء

مجلہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی کو جاری ہوئے سولہ سال گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں مختلف دینی اور علمی موضوعات پر اس میں کون کون سے مضامین شائع ہوتے ہیں؟ اور کن اصحاب علم کا اسے تعاون حاصل رہا ہے؟

مضامین اور مصنفین کا مکمل اشاریہ۔ تحقیقی کام کرنے والوں اور علمی و دینی مضامین سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک اہم ضرورت۔

صفحات: ۶۴ قیمت: ۱۰ روپئے

ملنے کا پتا: مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ

© rasailojaraid.com